ریاض احمد

تبصرہ کتب

'فلسفہ پاکستان میں' (Philosophy In Pakistan)

مرتب: ڈاکٹر نعیم احمد' لاہور ۱۹۹۶ء

پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے صدر ڈاکٹر نعیم احمد نے مندرجہ بالا عنوان سے پاکستانی فلاسفہ کے منتخب مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ پنجاب یونیورسٹی اور واشنگٹن (امریکہ) کے ایک ادارے (کونسل برائے تحقیق اقدار و فلسفہ

(Council For Research In Values And Philosophy)

نے باہمی تعاون سے شائع کیا ہے۔ یہ بات دو لحاظ سے اہم ہے' ایک تو یہ کہ علمی حلقوں میں اب بھی مغربی سند کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ امریکہ میں مضامین کا شائع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا معیار مغربی تحفظات (Reservations) کے باوجود ان لوگوں کے لیے قابل قبول ہے۔

کتاب کے دیباچے میں پروفیسر جارج ایف میکلین (Jeorge, F, Mclean) نے لکھا ہے کہ فلسفیوں کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی اپنی ثقافت کے خزینوں کی بازیافت کے لیے سعی کریں اور انہیں عام بحث و تمحیص کے لیے پیش کریں...

آئندہ صدی میں ایک کلی میلان اور باہمی فروغ کا امکان۔ ماضی کے مقابلے میں زیادہ روشن ہے جس کی تاریخ' تقابل بلکہ تصادم پر مشتمل ہے۔"

پاکستان کے حوالے سے ڈاکٹر نعیم احمد نے صورت حال کی وضاحت اس طرح کی ہے "پاکستان میں ایک مذہبی اساس معاشرتی شعور بالفعل موجود ہے۔ جذباتی سطح میں اس کی جڑیں بہت گہرائی تک اترتی ہیں۔ ہمارے اذہان میں اسے ایک نسلی توارث کی حیثیت حاصل ہے' یہ ایک اکتسابی تعصب بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ہمارے قومی تشخص کی نشاندہی کرتا ہے اور ہماری قومی وحدت کو تحفظ فراہم کرتا ہے' جو بہت سے انتشار انگیز میلانات کی زد میں ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مرکز گریز تخریب' یا عالمی قوتوں کی مقناطیسی کشش۔ جو بین الاقوامی امور میں مختلف میدانوں میں کارفرما ہے۔ جغرافیائی سیاست کے حوالے سے یہ بات بہت حد تک قابل قبول ہے۔ تاہم یہ تاریخی تسلسل کے اصول کی نفی کرتی ہے' جو قوموں کے ظہور کے عمل میں بالوضاحت موجود رہتا ہے۔"

اس اصول کی بناء پر پاکستان کی تاریخ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے شروع نہیں ہوتی۔ چنانچہ ڈاکٹر نعیم احمد فلسفے کی روایت کے ڈانڈے اور اس کے فروغ کی رفتار کو اس عملی تحریک سے ملاتے ہیں' جسے کسی وقت مشرق وسطی میں عروج حاصل ہوا تھا۔ اس تحریک کا سب سے اہم نکتہ یہ تھا کہ اس نے یونانی فلسفہ کو از سرنو مرتب کیا' اس کی شرحیں لکھیں اور دنیا کو اس سے روشناس کرایا۔ لیکن یہ کسب و استفادہ کا انفعالی رجحان نہیں تھا۔ اس میں ایک فعال تنقیدی بصیرت بھی عمل پیرا تھی۔ سپین کی جن اسلامی درسگاہوں کی مدد سے فلسفے کو دوبارہ یورپ میں پھلنے پھولنے کا موقعہ ملا' ان کے اساتذہ میں ایک اہم نام امام غزالی کا تھا۔ فلسفے کے اس "دشمن فلسفی" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے نہ صرف فلسفے کو اس کے اپنے ہتھیاروں سے شکست دی بلکہ جس مہارت

اور گہری بصیرت سے اس نے رد و ابطال کے لیے فلسفیانہ مسائل کا احاطہ کیا وہ فلسفے کے حامیوں کو بھی کم نصیب ہوئی ہے۔ امام موصوف کے آثار رومی سے ہوتے ہوئے شاہ ولی اللہ تک پہنچتے ہیں۔ اس طرح حکمت یونان اور حکمت ایمان کے دو مکاتیب وجود میں آئے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کی ابتداء سندھ سے ہوئی۔ چنانچہ اس خطے میں قرامطہ کے زیر اثر اس باطنی تحریک کے اثرات بھی نمایاں ہیں جس نے راسخ العقیدہ علماء کی مخالفت کے باوجود امام زکریا رازی' ابن سینا اور رسائل اخوان الصفا کے گمنام مصنفین کو جنم دیا۔ ان دونوں تحریکوں کے صحت مند آثار کو برصغیر میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی' ملا محمد جونپوری اور ملا محب اللہ بہاری نے زندہ رکھا۔ فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ان حکماء کو ہندوستان سے باہر شہرت اور پذیرائی نہیں ملی۔ کچھ کمتر لوگ نسبتاً زیادہ مشہور ہوئے جس سے یہ غلط تاثر ابھرا کہ برصغیر میں اسلامی فلسفے کی روایت سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ صوفیا نے فلسفے کو قابل اعتناء نہیں سمجھا۔ لیکن تنہا ابن عربی نے فلسفیانہ تصورات کو اس حد تک متاثر کیا کہ ابن تیمیہ سے لے کر اقبال تک کی مخالفت کے باوجود ان کا اثر و نفوذ کم نہ ہوسکا۔ بعد میں بھگتی تحریک نے بھی اس تاثر کو گہرا کیا۔ یہ مختصر تذکرہ ہمیں سرسید اور علامہ اقبال تک لے آتا ہے' سرسید کی نیچریت میں دو منفی رجحانات کارفرما تھے۔ یعنی مغرب کی نام نہاد روشن خیالی کے سامنے سپراندازی اور عیسائی مشنریوں سے مناظرہ بازی میں اسلام کا عقلی دفاع۔ البتہ اقبال نے بقول ڈاکٹر تاثیر مغرب و مشرق کے درمیان پل کا فریضہ سرانجام دیا اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ تاہم یہاں ڈاکٹر نعیم احمد ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں اور یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ اقبال نے ہمیں مغربی سند سے بے نیاز کر دیا اور ایک جرات اظہار عطا کی۔

یہاں دیباچے کا خلاصہ پیش کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی یہ ظاہر کرنا

مقصود ہے کہ مولف موصوف نے پاکستان میں فلسفے کے فروغ کا اثبات کس طرح کیا ہے؟ مقصود صرف اتنا ہے کہ ان تصریحات کو پیش نظر رکھا جائے تو کتاب میں شامل مضامین کی مشترکہ جہت کا سراغ لگانا سہل ہو جاتا ہے' اور یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ انہی مضامین کو بالخصوص کیوں منتخب کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ جن مصنفین کے مضامین یہاں پیش کئے گئے ہیں' انہوں نے پاکستان میں فلسفیانہ روایت کی آبیاری میں فکری اور عملی سطح پر اہم کردار ادا کیا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندو فلسفے سے مغرب بخوبی آشنا ہے۔ اس طرح یہ غلط روایت جڑ پکڑ گئی ہے کہ پاکستانی فلسفہ بھی اسی ہندوستانی فلسفے کی ایک شاخ ہے۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ اسلامی فلسفے نے ابتداء میں انہی خطوں میں فروغ پایا جو اب پاکستان میں شامل ہیں۔ بدقسمتی سے سلطان محمود غزنوی کے حملوں نے سومنات کے ساتھ ساتھ ملتان تک پھیلے ہوئے ان مدارس کو ختم کر دیا جو قرامطی حکمرانوں نے قائم کئے تھے۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پاکستان میں ان خطوں کی شمولیت کا باعث صرف ان کی جغرافیائی یا معاشرتی حیثیت ہی نہیں تھی' تحریک پاکستان کے لیے علمی اور فکری اساس مہیا کرنے میں بھی انہیں اولیت حاصل تھی۔

اس کتاب میں جن مفکرین کے مضامین شامل ہیں ان میں وہ بزرگ فلسفی بھی شامل ہیں جنہوں نے قیام پاکستان سے پہلے اپنی حیثیت بین الاقوامی سطح پر منوا لی تھی۔ پروفیسر ایم ایم شریف ان میں سرفہرست ہیں۔ جدید دور میں اسلامی فلسفہ کی تاریخ منضبط کرنے میں انہوں نے اہم فریضہ ادا کیا۔ برصغیر میں فلسفے کے فروغ کے لیے انہوں نے بڑی سرگرمی اور عملی جدوجہد کا مظاہرہ کیا۔ ان کے ساتھ ساتھ خلیفہ عبدالحکیم' جنہیں فکر اقبال کے شارح کی حیثیت سے ایک مقام حاصل ہے' قاضی ایم اسلم اور ڈاکٹر سی اے قادر' مولانا محمد حنیف ندوی وغیرہ بھی تعارف کے محتاج نہیں۔ جدید دور میں پاکستان کے نامور دانشور

ڈاکٹر محمد اجمل (مرحوم) کا نام سرفہرست آتا ہے۔ پروفیسر شریف اور ڈاکٹر قادر کے مضامین پر ایک نظر ڈالنے ہی سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کی نظر کتنی وسیع تھی، فلسفہ تاریخ کا کون سا مکتب ہے جس سے پروفیسر موصوف نے تعرض نہیں کیا۔ ڈاکٹر قادر کا مضمون اگرچہ ذاتی حوالے سے لکھا گیا ہے لیکن فلسفے کے مختلف مکاتیب کا گویا ایک انڈیکس مہیا کرتا ہے۔ عام قاری یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ ان لوگوں نے جتنا کچھ اور جس بلند تر سطح پر لکھ ڈالا، اس کو اپنے ذہن میں سمیٹ لینا بھی ناممکن نظر آتا ہے۔ بعد میں دوسرے اساتذہ نے بھی اس روایت کو زندہ رکھا۔

فلسفیوں کے انکشافات اور فتوحات ہر عہد میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ سائنس کے مضامین میں اگر تخصیص کو اولیت حاصل ہے تو فلسفہ میں وسعت نظر کو فلسفی جملہ علوم کا جامع ہوتا ہے اس کے حاصل کردہ نتائج مرکزیت کی بجائے آفاقیت کے علمبردار ہوتے ہیں تاہم ان مضامین میں ایک مخصوص جہت کی نشاندہی کی جاسکتی ہے اور وہ ہے تحریک پاکستان کا علمی اور فکری منظرنامہ۔ علامہ اقبال نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے: میں نے اپنی زندگی کا زائد حصہ اسلام، اور اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیمات اسلامی کی روح سے رہا ہے۔ جیسا کہ مختلف عہد میں اس کا اظہار ہوا ہے۔ میں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے۔" (خطبہ صدارت الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰)

اقبال سے مغربی فکر کے غلبہ و استیلاء سے آزادی کی جو روایت منسوب کی گئی ہے اس کا مظاہرہ ان مضامین میں بہت واضح ہے۔ پہلے ہی مضمون میں پروفیسر شریف فلسفہ تاریخ کے مختلف مکاتیب کو جس جرات و بے باکی سے رد کرتے ہیں، وہ ایک خوشگوار حیرت کا باعث بنتی ہے "ایسی چنگاری بھی یارب

اپنی خاکستر میں تھی۔" اس پر مستزاد یہ کہ وہ صرف اپنا نکتہ نظر ہی پیش نہیں کرتے بلکہ اس میں مشرق کے لیے امید کا ایک پیغام بھی موجود ہے۔ علامہ اقبال نے ۱۹۲۴ء میں پیام مشرق کے دیباچہ میں مغرب کی زوال پذیر معاشرت و تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے یہ اشارہ کیا تھا "امریکہ مغربی تہذیب کے عناصر میں ایک صحیح عنصر معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ ملک قدیم روایات کی زنجیروں سے آزاد ہے اور اس کا اجتماعی وجدان نئے اثرات کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔" لیکن دوسری عالم گیر جنگ کے بعد امریکہ اپنی چہار گونہ آزادیوں کے منشور کے باوصف بتدریج مغربی سامراجی مزاج کے سانچے میں ڈھل گیا۔ پروفیسر شریف بھی اپنے تجزیے میں اسی نکتہ پر پہنچے ہیں کہ مستقبل کا کلچر مشرق و مغرب کی بہترین روایات کے امتزاج سے تشکیل پذیر ہوگا اور اس کا ظہور جنوبی ایشیا (پاک و ہند) یا امریکہ میں ہوگا۔ یہ انداز نظر دوسرے مضامین میں براہ راست یا بالواسطہ جھلکتا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلامی شعائر، عقائد اور اقدار کے متعلق معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہیں کیا گیا۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ فلسفہ محض علم نہیں بلکہ ایک درجہ بھی ہے یعنی دانشمندانہ ضبط نفس یا مستقل مزاجی، تو یوں کہہ لیجئے کہ یہ مضامین مجموعی طور پر ایک منفرد فلسفیانہ روح یا رویے کے حامل ہیں۔

قاضی ایم اسلم نے اقبال کے خطبات کے مختصر دیباچے میں ایک جہان معنی تخلیق کیا ہے، گویا یہ دو تین صفحے سات خطبوں کے جملہ مباحث کا نچوڑ ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم، مولانا ندوی، ڈاکٹر عبدالخالق اور پروفیسر سعید شیخ کے مضامین میں تو خیر اسلامی اقدار کے تذکار کا ایک خزینہ موجود ہے۔ لیکن ڈاکٹر قادر اور عالمی فلسفے کے فروغ سے بحث کرتے ہوئے جب قران مجید کے حوالے سے اس بات کا جواب دیتے ہیں کہ What Does God Mean To Me

تو صرف اللہ کی رحمت پر ان کا ایمان عام رسمی ایمان کے مقابلے میں کہیں زیادہ مستحکم نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر خالق بھی مسلم فلسفہ کی ترجیحات کا تعین کرتے ہوئے Cannonial Prayer یعنی نماز شرعی کو خداشناسی کے لیے بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ جس کے بغیر God Consciousness عرفان الٰہی حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی صوفیانہ مسلک کے مطابق وصال ممکن ہے۔ حنیف ندوی کے مضمون کا ترجمہ انہوں نے کمال مہارت سے کیا ہے کہ اس پر اصل کا گمان گزرتا ہے۔ اس مضمون کا مطالعہ کرتے وقت وہی خوش گوار حیرت نصیب ہوتی ہے کہ مشرق کا ایک فلسفی، مغرب کے فلسفیوں کو رد کرنے میں لمحہ بھر کو جھجک محسوس نہیں کرتا۔ اسی طرح العباد احمد۔ ڈی۔ ایم آسٹرانگ اور ان کے ہم خیالوں کو (Mind) ذہن کے متعلق اس خیال کو کہ وہ بجز دماغ کی فعلیت کے اور کچھ نہیں۔ دلائل سے رد کرتے ہیں تو احساس کمتری کا کوئی شائبہ ان کے ہاں نہیں ابھرتا۔ بلکہ ان کے رویے میں طنز کی جارحیت پائی جاتی ہے۔ جس سے اس فلسفی کی روح جس نے کہا تھا "I think, therefore I Am...." عدم آباد میں یقیناً جھوم اٹھی ہوگی، علم اسلامی کے تناظر میں ایک بہت اہم مضمون ہے اس کا لہجہ اور استدلال خالصتاً عقلی اور فلسفیانہ نوعیت کا حامل ہے تاہم یہاں بھی صدیقی صاحب اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انیسویں صدی کے کلچر نے جس ایمانی تذبذب کو جنم دیا تھا اس سے پیدا ہونے والے خلاء کو پر کرنے کے لیے ماضی کے مذہبی ایقان کی ضرورت کو خود مغربی دانشوروں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ کتاب کا آخری مضمون صرف خواص کے لیے ہے۔ اس کتاب میں اس کی شمولیت سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستانی فلسفی جدید علوم سے آگاہ ہیں، علم کا کوئی گوشہ ان کی دسترس سے باہر نہیں۔ یہ مضمون ان دقیق شعبوں سے متعلق ہے۔ جو ریاضیاتی منطق وغیرہ سے بحث کرتا ہے۔ مغرب میں بھی اس کا اپنا چلن نہیں، کیونکہ کہا جاتا ہے کہ رسل اور وائٹ ہیڈ کی اصول ریاضی

Principia Mathematica کم ہی پڑھی جاتی ہے اور اس سے بھی کم سمجھی جاتی ہے۔

القصہ "فلسفہ پاکستان میں" جو فلسفیوں کے بلند پایہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس کی تہ میں ایک مشترکہ فکری لہر جولاں ہے۔ جس کو فاضل مولف نے یوں بیان کیا ہے کہ پاکستان میں ایک "مذہب اساس سماجی صورت حال کارفرما ہے" ان مضامین میں جہاں مجرد فلسفیانہ منطقی رویہ شعوری طور پر اختیار کیا گیا ہے وہاں پر بعض فاضل دوست یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ ہندوستان میں ٹیگور اور گاندھی کا نظریہ مذہبی امتزاج کسی مثبت اور پائیدار رواداری پر منتج نہ ہوسکا یہ اخلاقی اور ذہنی جرات کے فقدان اور زندگی کی طرف ایک غیرانسانی رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔ (ٹیگور یا گاندھی جی تو بہ قول مقالہ نگار صحیح نظریہ رواداری کی تخلیق میں ناکام رہے۔ لیکن برصغیر پاک و ہند کی جدید تاریخ میں کیا کوئی مسلم مفکر یا دانش ور صحیح نظریہ رواداری کی تخلیق و تبلیغ میں کامیاب رہا؟ آج مسلم سوسائٹی میں مذہب کے نام پر مذہب کے پاکیزہ اصولوں' خاص طور پر "رواداری" کا جس انداز سے خون کیا جا رہا ہے' اس پر فاضل مقالہ نگار کو تفصیل سے لکھنا چاہیے تھا۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ ٹیگور کی آنکھ کا تنکا دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی آنکھ کا "شہتیر" بھی دیکھ لیتے۔ ادارہ) اس سوچ میں نظریہ پاکستان کی فلسفیانہ بنیاد جھلکتی ہے یا اسے حکمت ایمانیاں کہہ لیجئے۔ انہوں نے سائنسی فکر اور ماورائی فکر Transcendental جو تفریق قائم کی ہے اس پر اقبال کی اصطلاح دانش برہانی اور دانش نورانی یاد آتی ہے۔

ہمارے ہاں فکری اور علمی افلاس ایک تشویش ناک حد کو چھو رہا ہے۔ جس کے اثرات ہمارے معاشرہ کے ہر شعبے میں نمایاں ہیں' اور جو لوگ عموماً علمی مشاغل میں مصروف ہیں' ان کی تحریروں میں سطحیت بہت نمایاں ہے' مغربی علوم کو امتحان پاس کرنے کے لیے تو پڑھا جاتا ہے۔ لیکن اپنی ذہنی استعداد

بڑھانے کے لیے ان کی طرف التفات نہیں کیا جاتا۔ مغرب میں بالعموم یونیورسٹی تک جانے سے پہلے ایک عام طالب علم اپنے فکری پس منظر سے واقف ہوتا ہے۔ خصوصاً فلسفے کا مطالعہ تو اس ذہنی استعداد کے لیے ناگزیر ہے۔ ہمارے ہاں بھی پہلے وقتوں میں علماء علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ان میں شعراء بھی شامل تھے۔ اس نوع کی کتابیں شاید عام قارئین میں ذوق علم کے لیے مہمیز کا کام دیں۔ ہمارے ہاں سوائے چند ایک کے بیشتر لوگ جدید علوم اور جدید فلسفیانہ آگہی سے محروم ہیں۔ کالجوں اور دانش گاہوں کے اساتذہ کی بات دوسری ہے کہ اپنے اپنے شعبے میں انہیں دسترس حاصل کرنا ان کی مجبوری ہوتی ہے۔ (اس کتاب میں جن فلسفیوں کے مضامین شامل ہیں' ان کا تعلق درس و تدریس ہی سے ہے) بہرحال ایک عام قاری کے لیے وسیع تر اور بلند تر علمی پس منظر مہیا کرنا بھی ہماری فکری ترجیحات میں شامل ہونا چاہیے۔ یہ کتاب ان ترجیحات کو ایک حد تک پورا کرتی ہے۔ اور محدود مطالعہ کے حامل شخص بھی "بقدر لب و دنداں" استفادہ کر سکتے ہیں۔ بے شبہ یہ کتاب قاری کے ذہن پر پاکستان میں علمی رفتار کا ایک جاندار تاثر مرتب کرتی ہے۔ پاکستان کی ثقافت' تہذیب اور معاشرہ کے متعلق اس کے شعور کو ایک واضح اور مضبوط اساس مہیا کرتی ہے۔